قیصر تمکین / ہم، ایلیٹ اور ویسٹ لینڈ

بزرگوں اور عالموں کے اقوال کا حوالہ اس طرح دیا جاتا ہے۔ یا دیا جانا چاہیے جس طرح عدالتوں میں نظیریں پیش کی جاتی ہیں کسی ایک متنازعہ مسئلے پر اگر کسی بیدار مغز منصف نے کوئی یادگار فیصلہ دے دیا تو وہ حوالے کے طور پر اسی طرح کے یا اس سے ملتے جلتے مقدمات میں بطور سند پیش کیا جائے گا مگر معنی اس کے یہ نہیں ہوں گے کہ کسی ایک جج نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا تو دوسرے مسائل پر بھی اس کی رائے اسی طرح حتمی اور آخری تسلیم کی جا سکتی ہے۔ یہاں دو ضمن باتیں قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ منصف کا فیصلہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ترمیم کا متقاضی بھی ہو سکتا ہے۔ دوم یہ کہ ایک اچھے اور معقول فیصلے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مذکورہ منصف ہمیشہ کے لئے تنقید یا اختلاف رائے سے بالاتر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی قطعی و آخری اور ناقابل ترمیم و تنسیخ حیثیت صرف داعیان مذاہب کو حاصل رہی ہے جنہوں نے اضافی بصیرتوں سے چکا چوند نہیں پیدا کی بلکہ ایسے اعمال پیش کئے اور ایسے اقوال چھوڑ گئے جو وقت، مقام اور حدوث زمانہ سے بے نیاز ہمیشہ کے لئے منارۂ روشنی بنے رہیں گے۔ وہ پہلا پیغامبر انسانیت جس نے بہانگ دہل کہا کہ جھوٹ قابل نفریں اور سچ قابل ستائش ہے ہمارے لئے ہمیشہ لائق تعظیم رہے گا۔ توریت و زبور کے ارشادات عالیہ ہوں یا عشائے ربانی اہمیت ان کی یوں مسلم رہے گی کہ ان تعلیمات سے روگردانی کا نتیجہ ہمیشہ انسانیت کے دکھوں اور عوام الناس کی پریشانیوں کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔

مغربی تعلیم سے فیض یاب ہونے والوں کی اکثریت پہلے ہی حملے میں اس کی چکا چوند سے خیرہ نظر ہو کر رہ گئی۔ یہ نتیجہ تھا مغرب سے صرف ابتدائی اور معروضی واقفیت کا۔ پھر بھی اقبال کی طرح بہت سے اہل دانش ایسے تھے جنہوں نے ابتدائی واقفیت کے پہلے حملے کو برداشت کرنے کے بعد آگے بھی قدم بڑھائے اور مغرب کے ان گمراہ کن رجحانات کو بھی سمجھا جن کو ہماری نگاہوں سے مستور رکھنے کی ہر ممکن کوشش سامراجی نظم و نسق کے اداروں اور ان کے پہلو بہ پہلو چلنے والے کلیسائی مبلغوں نے کی۔ مغرب سے مرعوب ہو جانے کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس پچاس برسوں تک رہا اس کے بعد مغرب کی سیاسی بساط پر سوشلزم انقلاب

نے جو ترتیب و تدوین کی اس کا اثر بھی ۳۰ء اور ۴۰ء کی دہائیوں میں ہمارے ادبی و تعلیمی اداروں پر بہت گہرا ہوا لیکن صورت اس کی بھی وہی تھی جو مغرب کے دوسرے فکری اداروں کی یعنی ہم میں سے زیادہ تر لوگ بلا سوچے سمجھے نعرے لگانے والوں میں شامل ہو گئے (۱)۔ مغرب سے متاثر ہونے والوں، وہاں تعلیم حاصل کرنے والوں اور پھر سوویت یونین کے سیاسی تغیرات سے مسحور ہو کر رہ جانے والوں نے ہر مسلّمہ رجحان اور ہر مکتبِ فکر و عمل کی ردوقدح کی اور انتہائی شدت پسندی کے ساتھ "نئے پن" میں مبتلا ہو گئے اور یہ بھول گئے کہ جس عقائد پرستی یا اندھی تقلید کی نکتہ چینی وہ کر رہے تھے اس کا ارتکاب خود بھی تو کر رہے تھے۔ مذہب و شریعت پر آنکھ بند کر کے ایمان لانے والوں کو برا ٹھہرانے والے خود بھی تو آنکھیں بند کر کے لینن اور اسٹالن کے اقوال و اعمال پر ایمان لے آئے تھے اور کچھ اس شدت کے ساتھ کہ ان کی نظر میں مارکس سے اسٹالن تک کسی کی ہلکی سی تنقید بھی امریکا نوازی اور سرمایہ داروں کی حاشیہ برداری کے برابر سمجھ لی گئی تھی۔ ایک طرف تو کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بعض قائدین نے آنکھیں بند کر کے مارکس واد کو تنقید و تنقیص سے مبرا سمجھ لیا اور دوسری طرف مغرب پسندوں نے انگریزی کے بعض سامراجی مصنفوں اور شاعروں کے اقوال اس طرح حوالے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیئے گویا "حقیقتِ اصلی" یہی ہو باقی ہر بات اضافی ۔ اگر مارکسیت، انگریزی ادب یا سوویت ترجیحات کے بارے میں علمی نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا تو کشادگیٔ فکر کے لئے بحث و تمحیص کے مفید باب کھلتے۔ مگر ہوا یہ کہ ہر چیز "عقلِ کل" یا حقیقتِ مسلمہ مان لی گئی اور اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی ایک پوری نسل کپلنگ کی دو سطروں "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ دونوں کا ملاپ کبھی نہ ہوگا" کا ورد کرتے گزر گئی۔ آج اکیسویں صدی کی حدوں پر کھڑے ہوئے ذرا ان لائنوں پر غور فرمائیے یہ ماننا پڑے گا کہ کپلنگ نے ایک مخصوص سامراجی طرزِ فکر کی ترجمانی کی جس کی وجوہ تک پہنچے بغیر ہماری پچھلی نسل نے اس کے اقوال کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیا۔

۳۰ء کی دہائی کے وسط سے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک انگریزی ادب کے جن ناقدوں اور شاعروں نے مجالس ادب کی اولین صفوں میں جگہیں حاصل کیں ان سب کو ہمارے بزرگوں نے رہنمائے فکر و شعر سمجھ لیا۔ اس دور میں آڈن، اسپنڈر اور پاؤنڈ نے اپنے تمام معاصرین کی چمک دمک دھندلا دی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں شعر و نقد کے میدان میں بھی پورا ایک جلوس ٹی

الس ایلیٹ کی قیادت میں رواں ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ۲۰ء
کی دہائی کے ابتدائی چند برسوں تک انگریزی ادب کے ایوانوں میں صرف ٹی الیس ایلیٹ کا ہی طوطی
بولتا رہا اور ہر چند کے اچھے صاحب فکر ناقدوں کی ایک پوری کھیپ انگریزی ہی نہیں بلکہ فرانسیسی،
امریکی اور روسی ادبیات میں بھی تیار ہو چکی تھی مگر زیادہ تر اہالیان اردو ان کی بابت ایک معصومانہ
اغماض میں ہی مگن رہے۔ اردو کے لوگوں نے ایلیٹ کو من و عن قابل تقلید سمجھ لیا۔ گو کہ بہت سے
لوگوں نے ایلیٹ کے فکر و فن پر تحسین محض ہی نہیں بلکہ منصفی و دیانت کے پہلوؤں سے بھی
سوچ بچار کیا مگر یہ امتیاز صرف اہل اردو کو ہی حاصل رہا کہ انہوں نے ایلیٹ کو ادب و فن کا منارۂ
روشنی مان کر اس کی ہاں میں ہاں ملانا ہی انتہائے تفکر کا نشان سمجھ لیا۔ آج بھی یہ حال ہے کہ اردو کے
ادبی حلقوں میں کوئی ایسا صاحب فکر ہے ہی نہیں جو یہ سوچ سکے کہ ایلیٹ بھی ایک خاکی انسان تھا۔ وہ
انسان جس کے بارے میں ام الکتاب کا ارشاد ہے کہ وہ مجموعۂ خطا و نسیان ہوتا ہے اور جسکے قول و
فعل کے بارے میں دو رائیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ہندو پاکستان کی تمام
جامعات میں انگریزی ادب خوب دھوم دھام سے پڑھایا جاتا ہے اور اس ادب کو اس طرح منزہ، طاہر
اور ماورائے تنقید سمجھ لیا گیا ہے گویا وہ کوئی الہامی درجہ رکھتا ہو۔ آج بھی تمام یونیورسٹیوں میں ہمہ
وقت مغربی ادبیات کی خوبیاں ہی معرض بحث میں رہتی ہیں اور تقریباً ننانوے فیصد کی حد تک
اساتذہ و طلباء دانتے کی جہنم کے ناپاک ترین حصوں سے یا تو ناواقف رہتے ہیں یا ناواقف رہنے میں
عافیت سمجھتے ہیں۔ اطالوی ادب کا براہ راست علم ہونے کے باوجود عزیز احمد جیسے صاحب شعور ادیب
نے بھی دانتے کی صرف خوبیاں ہی گنائیں انہوں نے اس کے ذاتی تعصبات کا ذکر نہ کیا۔ جنت کے
آخری اور اعلیٰ ترین منطقے میں پہنچ کر شاعر نے جب بیاترچے کو دیکھا تو کیا سوال کیا اس سوال کی
توضیح و تشریح کلیسائی ادب نے کن کن پہلوؤں سے کی؟ کیا یہ فرض کرنا واقعی جائز ہو سکتا ہے کہ عزیز
احمد جیسا صاحب علم و شعور ان تشریحات سے بے خبر تھا؟

ایلیٹ صاحب بڑے صاحب فکر شاعر، نکتہ رس ناقد اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے قدردان
تھے۔ ان کی عظمت کا ہمہ وقت قصیدہ پڑھنے والے اردو داں حضرات کا کیا یہ منصب نہ تھا کہ وہ ان
حضرت کی مشرقی لندن کے غنڈوں اور موذی نسل پرستوں جیسی زبان کے بارے میں بھی کچھ کہتے؟
نسل انسانی کے ایک بڑے معتبر اور وقیع حصے کو نیم وحشی Sub Human قرار دینے کی روش اردو

تو کیا مشرق کے کسی بھی ادب (حتیٰ کہ ہندی کے نو فسطائی ادیبوں میں بھی) نہ ملے گی۔ ۱۹۲۰ء میں حضرت قبلۂ ادب ٹی ایس ایلیٹ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہودی تو چوہوں سے بھی گئے گذرے ہیں (The Jew is beneath the rats) ممکن ہے یہ لکھتے وقت ان کا ذہن نا پختہ ہو مگر بعد کی عمر میں جب وہ نوبل انعام سے نوازے جا چکے تھے تب تو اپنی "خام" فسطائیت پر اظہار شرمندگی کر سکتے تھے۔ مگر ہمارے علم میں تو ان کا کوئی ایسا جملہ یا تحریر موجود نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی نسل پرستی پر مبنی تصنیف کو رد کیا ہو یا سامراجی انداز اظہار پر معذرت کی ہو۔ ہمارے بزرگوں میں جو تقریباً سب ہی دوسری جنگ عظیم کے دور کی پیداوار تھے ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ کے بڑے چرچے تھے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول کی ابتداء ہی حضرت ایلیٹ صاحب کی آیات فاخرہ سے ہوتی ہے۔ عطیہ حسین کے ایک ناول کا نام ہی ایلیٹ کی نظم کے ایک ٹکڑے سے لیا گیا ہے۔

۱۹۸۸ء میں ایلیٹ کی پیدائش کی سویں سالگرہ منائی گئی اس موقع پر متعدد اشاعتی اداروں نے کتابیں شائع کیں۔ مگر "جیوش کرانیکل" کے لکھنے والوں نے جو تقریباً سبھی اہم، عالمگیر شہرت کے حامل اور اکثر نوبل انعام یافتہ بھی تھے، ایلیٹ کی یہود دشمنی پر بھی خوب جم کر مضامین لکھے۔ ان مضامین کا یہ فائدہ ہوا کہ ادب و شعر کے جن ایوانوں میں ایلیٹ کو قبلۂ رندان جہاں سمجھا جاتا تھا وہاں بھی دھوم دھام کی نے ذرا مدھم رہی۔ دو تین لکھنے والوں نے ایلیٹ کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دی بہت سے یہودی دانشور جنہوں نے نسل کشی کے مظاہر دیکھے تھے اب بھی تند و تیز لہجوں میں برابر لکھ رہے ہیں چنانچہ حال ہی میں (۱۹۹۵ء) میں انتھونی جولیس نامی ایک صاحب نے جو بہت بلند پایہ وکیل اور QC ہیں ایک عصر آفرین تصنیف پیش کی۔ اس کتاب کا نام ہے "ٹی ایس ایلیٹ، صیہونیت دشمنی اور ادبی اسلوب"۔ پورے دو سال اسی ایک کتاب پر لے دے میں گذر گئے۔ مغربی ادبی حلقوں میں ہر جگہ ٹی ایس ایلیٹ کی یہود دشمنی موضوع بحث بنی رہی۔ ایلیٹ نے جگہ جگہ جس ذلت و حقارت سے یہودیوں کا ذکر کیا ہے اس کا بھی احتساب ہوا۔ اسی کے ساتھ بات یہ بھی ایک بار پھر تسلیم کر لی گئی کہ علم و ادب کے میدان میں آگے آگے یہودی عالم اور دانشور ہیں اور اگر یہ طبقہ کسی کے خلاف ہو جائے تو اس کا پنپنا دشوار ہو جاتا ہے چنانچہ اس طبقے کا ایک احسان اردو دانوں پر بھی ہے کہ اس نے ایلیٹ پرستی کے سومناتوں (یا بتکدۂ تصورات) میں ضربت محمود کا کام کیا۔ پچھلے سات آٹھ برسوں میں یہ بات بہرحال مان لی گئی کہ بحیثیت مجموعی ٹی ایس ایلیٹ ایک مخصوص

مریضانہ مسیحیت اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ سامراجیت کا مارا ہوا دوسرے درجے کا نسل پرست اور مفسد تھا۔ سفید فام اقوام کی رعونت آمیز نرگسیت میں درجہ اس کا کسی طرح ٹینیسن یا کپلنگ سے کم نہ تھا۔ استعماریت کے دور نصف النہار میں جب تیسری دنیا کے عام ممالک پر قدیم تہذیبوں اور زبانوں کی موجودگی کے باوجود کپلنگ اور ایلیٹ جیسے یرقان زدہ دانایان مغرب کی عظمت ہم پر مسلط کی گئی تھی اس کی طرح کے اینٹھے ہوئے لوگ خوب اکڑ کر چلتے تھے اور غریب غرباء ان کی توجہ کے طالب ہوتے یا اپنی چھوٹی موٹی ادبی شخصیت کے چکر میں ان کو خوب جھک کر سلام کرتے تھے۔

جس طرح ایلیٹ کو ماورائے تنقید اور بے عیب مان لیا گیا ہے اسی طرح عام طور پر تیسری دنیا میں اور خاص طور پر اردو ادب پرستوں میں اس کی نظم "ویسٹ لینڈ" بھی ایک مقدس صحیفہ تسلیم کر لی گئی ہے۔ بعض مضامین میں یا اردو ادیبوں کی تحریروں میں اس کے حوالے اس طرح دیئے جاتے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے لکھنے والے نے یہ نظم پڑھنے کی زحمت ہی نہیں گوارہ کی ہے۔ بہت سے طالب علم انگریزی کا مقررہ نصاب پڑھ کر پاس ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ادب میں بھی بہت سے لکھنے والے کچھ منظور شدہ تخلیقات منظور شدہ پیمانوں کے مطابق پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں دوبارہ کسی علمی و تنقیدی نظر سے اس سرمائے کا مطالعہ بہت گراں گزرتا ہے۔ چنانچہ ایلیٹ کی عام تحریروں کی طرح ویسٹ لینڈ کے بارے میں بھی اگر ہم یہ فرض کریں کہ اصل میں اردو ناقدوں یا ادب شناسوں نے اس کا غیر جانبداری سے مطالعہ ہی نہیں کیا ہے تو بہت زیادہ برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

پیروی مغرب اور ایلیٹ پرستی کے ضمن میں ہی ذکر اس نظم کا بھی ضروری ہے۔ نقد و ادب کے بارے میں ایلیٹ کی بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ لیکن اس کی انتقادی صلاحیتوں اور انداز نظر پر ہمیشہ اچھی خاصی بحث ہوتی رہی ہے۔ جو بات اردو حلقوں میں بالکل ہی غیر اختلافی مان لی گئی ہے (وحی و الہام کی طرح) وہ اس کے منظوم ڈرامہ کی عصری آگہی اور اصول نقد نہیں بلکہ صرف ویسٹ لینڈ ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے کوئی ایسی تحریر ملتی ہی نہیں ہے جس میں ویسٹ لینڈ کو آیات وجدانی نہ مانا گیا ہو۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے عام ڈھانچے، ہیئت اور ساخت کے بارے میں ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی بات چیت ہو جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پوری نظم کا ڈھانچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے اور ایک انجانی قسم کا کہربائی جمال رکھتا ہے۔ جو خاکے اور تصورات ہمارے ذہنوں میں مبہم مبہم ہیولے بناتے ہیں وہ کبھی تو بہت ہی

نادر ہیں اور کبھی ایک تیکھی شدت کے ساتھ اثر آفریں لگتے ہیں۔ ان تصورات کی تجسیم کو واضح طور پر سمجھنا صبر آزما ضروری ہے لیکن جب قاری اچھی طرح سمجھ جاتا ہے تو پھر یہ کچھ اس طرح اس کے پورے نظام فکر کو مرتعش کر دیتے ہیں کہ لگتا ہے جیسے وہ ابھی کسی الجھے الجھے خواب سے بیدار ہوا ہو۔ نظم کے ساتھ ایک خوش قسمتی یہ وابستہ رہی ہے کہ وہ ایسے وقت شائع ہوئی (۱۹۲۲ء) جب یورپی جہان فکر کی بساط ہی الٹی پڑی تھی۔ یہ زمانہ ۲۰ء کی دہائی کا تھا۔ پہلی جنگ عظیم اور اس کے مضمرات کی بنا پر ادب و شعر کے ایوانوں میں شام غریباں کا سا عالم طاری تھا۔ شک و شبہے کی فراوانی تو ہمیشہ ہی ذہین اور اعلیٰ دماغوں میں رہتی ہے۔ مگر اس ذہانت یا اپنی اپنی انفرادی فطانت کی وجہ سے زیادہ تر ادیب و فنکار کسی نہ کسی منارۂ روشنی کا واضح یا مبہم ادراک بھی ضرور رکھتے ہیں یہ ابہام اور تشکیک ویسٹ لینڈ میں پوری طرح جاری و ساری ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نظم کا ایک تہائی حصہ ایذرا پاؤنڈ نے حذف کر دیا کیونکہ بقول جوش اس کا خیال تھا کہ

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو   کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

ہم یہ سوچ کر ذرا چکرا جاتے ہیں کہ اگر حذف شدہ حصے بھی نظم میں شامل ہوتے تو یہ واقعی کتنی پیچیدہ اور گنجلک ہوتی۔ بقول ایک ادیب کے "تب یہ ملغوبہ اور بھی زیادہ گاڑھا ہوتا"۔ معترض نے اپنی بات کے ثبوت میں کہا کہ اگر یہ معمہ چیں واقعی ایک گرا مایہ پارۂ ادب ہوتا تو ایلیٹ کو چار صفحات پر مشتمل ماخذات، مفاہیم اور مطالب کا دفتر نہ شائع کرنا پڑتا۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ ایلیٹ بھی شا کی طرح ایک مشتہر تھا جس طرح شا اپنے ڈراموں کے ساتھ طویل مقدمات اور "ابتدائیے" لکھتا اسی طرح ایلیٹ نے بھی ویسٹ لینڈ کے ساتھ چار صفحات پر توضیحات تحریر فرمائیں۔ سوال یہ ہے کہ شیکسپیئر اور کیٹس کو اس طرح کی "بھومکا" باندھنے کی ضرورت کیوں نہ پڑی؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نظم کا خمیر اپنے دور کے اضطراب سے اٹھا ہے۔ مگر اس بات کو قطعیت کے ساتھ تسلیم کرنا مشکل ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے امن پسندوں کو ہی نہیں بلکہ عام طور پر پوری دنیا کے حساس لوگوں کی نبضیں مرتعش کر دی تھیں اور وہ ایک دوسری لڑائی کے تصور ہی سے لرزاں اور ہراساں تھے۔ بے روزگاری اپنی انتہا پر تھی کیونکہ معاشی اور پیداواری ڈھانچے ہی الٹے پڑے تھے۔ جلد ہی ۱۹۲۹ء میں وال اسٹریٹ میں بھی بھونچال آگیا۔ انقلابات ہو بھی رہے تھے اور مزید انقلابات کے خطرات بھی منڈلا رہے تھے لیکن خطرات کے نتیجے میں اکثر جنگوں پر رزاج.

تطہیر اور نسل کشی کے مظاہر اور قتل و غارت کی بھی ارزانی تھی۔ چوتھی بات جو "شرفا" کے طبقے کے ادیبوں کے لیے بے خوابی کا باعث تھی وہ تھا نظام اخلاق کا انحطاط۔ ایک باشعور شاعر یقیناً ان امور کی طرف اشارے کر سکتا تھا۔ "فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل" کی طرح بھی توجہ کر سکتا تھا۔ یہ توقعات ویسٹ لینڈ سے پوری نہیں ہوتی ہیں۔ پوری نظم ایک ایسی "قرۃ العینیت" قسم کی غمزدگی کی ماری ہوئی لگتی ہے جو کسی معاشی، یا سیاسی شعور کی پیداوار نہیں بلکہ غماز ایک بالکل ہی ذاتی احساس زیاں کی ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب جب یہ فرماتے ہیں کہ بعض باہمی مشرقی یورپ کے انحطاط سے متعلق ہیں تو مطلب ان کا اس سے صریحاً بالشویزم، اشتمالیت اور عوامی طاقت کے ظہور اور مذہبی توہمات و معتقدات کی شکست و ریخت سے ہوتا ہے۔ کچھ حضرات یہ مطلب اخذ کر لیتے ہیں کہ ایلیٹ نے جب خود کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ پھر بھی نظم کو بلا کسی "تفسیر" کے پڑھنے کے بعد قاری کو ان اضطرابات کی وجوہ سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر یہ نظم اپنے دور کی نمائندہ ہے تو پھر اس سے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی تاریخ کے طالب علم کو بجز تاریکی کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا ہے۔ بے روزگاری، مفلسی، فاقہ کشی و معاشی تباہی اور سامراج کے خلاف جدوجہد کی تحریکوں کا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ جس جنگ کے پس منظر میں "یہ ہنومان چالیسہ" مرتب کیا گیا ہے اس کا ذکر کسی المیے کے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس سے ایک کھاتے پیتے طبقے والی بیزاری (بوریت) کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ Think of poor Albert,

He's been in the army for four years, he wants a good time.

یہاں میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں پڑھے ہوئے ایک مضمون کا اقتباس پیش کروں گا۔ یہ مضمون کسی ایسے رسالے میں تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہ گیا ہے اور نہ مصنف ہی کے بارے میں کچھ یاد ہے۔ اقتباس ضرور میری ڈائری میں محفوظ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> " یہ ایک بالکل ذاتی نظم ہے۔ جس میں بہت ہی ذاتی قسم کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مگر ان الجھنوں کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے۔ اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو یہ ساری الجھنیں اور پریشانیاں ان وسوسوں اور اندیشوں سے بالکل مختلف ہیں جو ۲۰ء کی دہائی میں عام طور پر حساس لوگوں اور خاص طور پر ادیبوں اور فنکاروں کے ذہنوں پر کچوکے لگا رہے تھے۔"

اس کے باوجود "ویسٹ لینڈ" کے لب و لہجے نے اپنے دور کے حساس لوگوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ وہ دور جو شکست تصورات کا دور تھا، وہ دور جو اپنے آپ سے نفرت کا دور تھا، وہ دور جو علائق دنیا سے بے زاری کا دور تھا، وہ دور جو انسانیت پر اعتماد کی تنسیخ کا دور تھا اور سب سے بڑھ کر وہ دور جس میں ریاضی کے فارمولا کی طرح اٹل مسیحی تصورات ڈانواں ڈول ہو رہے تھے اس دور میں ایک نرگسیت میں مبتلا ادیب و فنکار کے لئے عرفان یا نروان کا راستہ ترک دنیا، تیاگ یا سنیاس ہی رہ گیا تھا۔ (ایلیٹ نے اپنے تنقیدی مضامین میں جگہ جگہ "روحانی" اور ذہنی دنیا میں نراج کی طرف جھکاؤ پر اظہار تاسف کیا ہے) مگر یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ سامراجی دنیا کے تقریباً تمام سفید فام دانشور اسی طرز فکر کے مارے ہوئے تھے۔ ایلیٹ بھی اپنے دور کی پیداوار تھے اور اپنے دور سے الگ ہو کر سوچنے پر قادر ہی نہیں تھے۔ ان معنوں میں اگر انہوں نے اپنے دور کے سفید فام مفکروں کی یوریت اور سوچ کا ایک مرکب تیار کیا تو ارض ویراں Waste Land یقیناً اپنے دور کی نمائندہ نظم ہے۔ اس کو آفاقی، انسانی، کلاسیکی وغیرہ کے زمرے میں شامل کرنا کہاں تک صحیح ہے اس کے بارے میں ہم ادب دوستوں کو سوچ کی دعوت دیں گے۔

نظم میں دو عین باتیں اور بھی قابل ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس میں دور دراز کی تلمیحات استعمال کی گئی ہیں کہیں کہیں بہت واضح صنمیات کی طرف اشارے ہیں۔ اکثر مصرعوں میں خود ایلیٹ ہی کی پرانی نظموں کے ٹکڑے یا ترکیبیں ہیں۔ نئی و پرانی کتابوں اور مذہبی صحیفوں کے اقتباسات بھی موجود ہیں چنانچہ کہیں تو سینٹ آگسٹن کے اعترافات ہیں اور کہیں گوتم بدھ کے موعظات۔ ورلین، واگز اور بودلیئر کی سطریں بھی من و عن پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ گولڈ اسمتھ کی پیروڈی بھی شامل ہے، ایک یونانی نوحہ بھی مذکور ہے، پیٹرونیس (Petronius) کا طنزیہ بھی ہے، ایک ہزار سال قبل نیپلز کے قریب سبل (Sybil) نامی جو راہبہ ایک مٹکے میں بدل گئی تھی اور اب قیامت تک مر ہی نہیں سکتی ہے اس کا ذکر بھی موجود ہے۔ ٹائر یسیس کے بارے میں بھی ہم کو جاننا ضروری ہے۔ وہ اندھا۔ نامرد اور تقریباً مردہ "شاہد" جو اب بھی سوچنے پر قادر ہے اور کہہ سکتا ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　　　عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

پھر لاطینی فقرے میں سنسکرت کے بھی کئی الفاظ شامل ہیں۔ ان تمام چیزوں کے مجموعے کو ایک دیوانی ہانڈی کی طرح پکا کر ہمارے دسترخوان پر سجایا گیا ہے لیکن دیوانی ہانڈی کا بھی ایک مزہ ہوتا

ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ دیوانی ہانڈی بنیادی طور پر پھیکی ہے۔ چنانچہ اس سے مستفیض ہونے کے بعد بھی چٹخارے لینے والی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔

نظم کا ایک بہت رواں قسم کا تاثر زندگی سے بےزاری اور خواہش موت ہے۔ یہ خواہش موت مفلسی یا جسمانی اذیت کی بناء پر نہیں بلکہ "روح" کی تھکاوٹ کی بنا پر ہے۔ یہ تھکاوٹ جسم کے ضعف اور قویٰ کے اضمحلال وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ خیال کی پراگندگی، سوچوں کی انتہا اور اپنی ذاتی انا کی "ڈھلمل یقینی" کی پیدا کردہ ہے۔ ایلیٹ نے یہ نظم ۳۴ سال کی عمر میں لکھی جب شاعر اپنے کو بہت ہی سن رسیدہ محسوس کر رہا تھا اور اس کو ایسا لگ رہا تھا گویا موت کسی اگلے موڑ پر اس سے معانقہ کرنے کی منتظر ہو۔ یہ خود سے بے زاری، بڑھاپے کا احساس، موت کی تمنا وغیرہ اگر دیکھا جائے تو پوری نظم کی فضا پر محیط ہے۔ خود نظم ہی اس کی تشریح بھی ہے اور اس کا رمزیہ بھی۔ ارض ویراں یا خرابہ ایک بے آب وگیاہ ریگستان بھی ہے ____ اور غرقابی Death by water کا نشان بھی!

اب دیکھئے نظم میں اشاریت کی بھرمار۔ زمین بانجھ ہے، پانی کو ترس رہی ہے درخت کہیں کوئی ہے ہی نہیں بس دھوپ ہے کہ آگ برسا رہی ہے، چٹانیں چٹخی جا رہی ہیں اور پھر تشنگی۔ ایک نہ ختم ہونے والی تشنگی ہے "وجود محض"۔ زندگی و موت کے درمیان ایک بے حسی کا عالم ہے۔ اس تمام اشاریت کے باوجود نظم کا آغاز بھی خوب ہے۔ آغاز بہار کو عام لوگ ہی نہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی امنگوں اور آرزوں کے پروان چڑھنے کا وقت سمجھتے ہیں مگر یہاں شاعر کی نظم ہی نہیں بلکہ بنیادی محسوسات تک پتھرا کر رہ گئے ہیں۔

April is the Cruellest month, mixing / Lilacs out of the dead land, mixing

Memory of desire stirring / Dull roots with spring rain

کہا جا سکتا ہے کہ نظم کا اہم موضوع ایک فرد واحد کی روحانی (ہم اس کو ذہنی کہنے پر اکتفا کریں گے) اذیت ہے یہ ذہن (یا روح) قبل از وقت کچھ اس طرح بوڑھا ہو چکا ہے کہ اس کو زندگی سے الجھن اور بے زاری ہے۔ پھر بھی ایک عام، ناکام بوڑھے کی طرح یہ روح، یہ ذہن مرنے پر آمادہ (یا قادر) نہیں ہے۔

شروع میں غیر فطری موت کا تصور نظم میں ایک غیر متعلق سا موضوع اختیار کرتا معلوم ہوتا ہے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ اصل میں یہی موضوع بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے واسطے نظم

کے بعض خوبصورت حصے وقف کئے گئے ہیں۔ جس طرح ایک دوست یا واقف کار کے ڈوب کر مرنے کی خبر ملٹن کو ایک نوحہ لکھنے پر مجبور کرتی ہے اسی طرح ایک جوان کے ڈوب جانے کے حادثے پر ایلیٹ یہ لکھنے پر مجبور ہے۔ (۲) These are Pearls that were his Eyes اس جوان کی موت ایک پہلے سے آزردہ دل شاعر کو کچھ اس طرح دنیا سے بے نیاز اور ذہنی طور پر بوڑھا کر دیتی ہے کہ اس کی اپنی حالت بنجر اور ویران زمین کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ کہنے میں کسی طرح کی بے انصافی کے ملزم نہیں قرار دیئے جا سکتے کہ ایلیٹ بنیادی طور پر قنوطی ہے (یہ بات مغرب والے اور خاص طور پر مسیحی دانشور کبھی بھی نہیں مانیں گے)اس کی قنوطیت بنیادی طور پر اس طرز تفکر کا نتیجہ ہے جس کے ڈانڈے "زوال بشر" کے اضمحلال کی حدوں سے ملتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر آپ دیکھئے کہ "خرابے" یا ارض ویراں سے نجات کے لئے راستہ ایلیٹ کو ایک ہی نظر آتا ہے عقائد و ایمان کی جستجو میں وہ عیسوی شریعت میں پناہ ڈھونڈھنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ کوئی درمیانی راستہ ایلیٹ کے خیال میں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ بات اس کی دوسری تحریروں میں جاری و ساری ہے کہ مغربی سماج و تصورات کو یا تو مسیحیت کا تابع ہو کر رہنا ہے یا پھر ادبار و کفر کی گھٹاؤں میں بھٹکنا پڑے گا۔ ادبار و کفر سے مراد وہ تمام تاریخی، تہذیبی اور مذہبی مسلمات ہیں جو "خدا کے بیٹے" کی راہ سے بال برابر بھی ہٹے ہوئے ہوں۔ ایلیٹ خود ہی یہ توضیح کرتا ہے کہ مسیحی تہذیب سے مراد کلیسائی رسوم نہیں بلکہ خالص عیسوی شریعت ہے جس کے تحت عہد نامہ عتیق کے آہنی اصولوں پر عامل حضرات ہی سماج میں بلند مرتبہ (یا یوں کہیے کہ "برہمن" کی حیثیت) کے حق دار ہوں گے۔ "کلیسا میں قتل" میں سامعین کو بتایا گیا ہے کہ عقیدہ اسی وقت تک سالم اور قابل تعظیم اور صحیح معنوں میں عقیدہ ہے جب تک اسکی اساسی تعظیم و حرمت کے لئے لوگ جان دینے پر آمادہ رہیں (ان معنوں میں تو وہی فلسطینی اور "بنیاد پرست" قابل احترام ٹھہرے جو اپنے ایمان اور عقیدے کے لئے جانیں دے رہے ہیں)ایک اعلیٰ ادبی جریدے نے ایلیٹ کو ادب کا نوبل انعام ملنے کے موقع پر لکھا تھا کہ ٹی ایس ایلیٹ نے بیسویں صدی میں پہلی بار یہ ثابت کیا کہ ایک ذہین اور فطین شخص عظیم شاعر ہوتے ہوئے بھی سچا دیندار ہو سکتا ہے۔ (۳)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نظم کو دو سطحوں پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ دو پہلوؤں سے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلی سطح تو یہ ہے کہ الفاظ کا طلسم اور اس تام جھام سے ایک

موسیقی پیدا کرنے کی کوشش کی تعریف کی جائے۔ اس طرح ہم کو نظم کے مقصد اور معنی سے زیادہ سروکار نہ ہوگا (پانچ میں سے صرف ایک لائن کا سر و پیر سمجھ میں آئے گا)۔ دوسرے پہلو سے وہ لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں جو کسی معمے کی طرح اسکی تلمیحات، حوالوں اور غیر ملکی الفاظ کے معانی وغیرہ پر غور کریں اور جس حوالے کا ماخذ معلوم ہو جائے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہوں۔

ایک قریبی دوست کی موت پر بہت سے شاعروں نے لکھا ہے۔ سامنے کی چیزیں دو ہیں، اول ملٹن کی Lycidas اور دوسری ٹینیسن کی In Memorium یہ دونوں بھی مسیحی تھے۔ دونوں کی نظموں کا بنیادی محرک ایک جوان کی تیراکی کے حادثے میں موت ہے۔ مگر دونوں نظموں میں حیرت ناک طریقے پر رجائیت ملتی ہے۔ ملٹن تو کلیسا کے اجارہ داروں کی تنقید بھی کرتا ہے اور ان کا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ لیکن نظم کا خاتمہ "ایک تازہ جنون تعمیر" کی طرح ہوتا ہے۔ صرف آخری لائن پر ہی غور فرمایئے۔ کتنا زندگی بخش لہجہ ہے To morrow to fresh woods and pastures new ٹینیسن بھی حیرتناک طور پر امید افزا لہجہ کا آئینہ دار ہے۔ وہ مسیحی ہونے کے باوجود بیمار مسیح نہیں ہے بلکہ حقیقتاً حضرت مسیح ناصری کے پیغام کا رمز شناس ہے۔

Ring out the wild bells from the wild sky / The year is dying, let him die

Ring out the thousand wars of old/ Ring in the thousand years of peace اور

اس کے مقابلے میں ایلیٹ ہم کو کہاں لے جاتا ہے۔ ہم کو سبق یہی ملتا ہے کہ انسان کی مادی زندگی اصل میں اسکی "روحانی" موت ہوتی ہے اور اس صورت حال کو سنوارنے کے لئے ضرورت رہبانیت یا Asceticism ترک دنیا کی ہے۔ اس کے لئے ہم کو گوتم بدھ اور سینٹ آگسٹن کے تیاگ سے سبق لینا چاہیے۔ خود ایلیٹ نے ۱۹۴۹ء میں ایک ہندوستانی ادیب رانجی شہانی سے گفتگو کرتے ہوئے اس باب میں بڑی متضاد باتیں کی تھیں۔ یہ مضمون یا انٹرویو جان آف لندن ویکلی John O' London Weekly میں اگست ۴۹ء میں چھپا تھا۔

شروع شروع میں جب ویسٹ لینڈ شائع ہوئی تو کئی رسائل نے اس کو دو تین نظموں یا مختلف ٹکڑوں کا مجموعہ سمجھا۔ بائیں بازو کے چند ادیبوں نے ضرور اس کی تنقید میں دلچسپی لی۔ New Statesman میں ایک مبصر نے Death by the water پر خاصا طنز کیا۔ حال ہی میں جب ایلیٹ کی تنگ نظری، تعصب، منفعل، نرگسیت اور گنجلک مسیحیت کے بارے میں طوفان اٹھا تو یہ

دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک ادیب نے ہماری ہی طرح کی بات کی یعنی اس نے بھی نظم کو منفی اور تضیع اوقات قرار دیا ہے اس کا جملہ یہ تھا:

(The Poem) offers no evidence of positive belief.

اس نظم کے اصل مزاج داں تو ایف آر لیوس تھے مگر انہوں نے بھی لکھا کہ نظم بالکل اسی طرح ختم ہوتی ہے جس طرح شروع ہوتی ہے۔ کہیں بھی رجائیت کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں۔ اور کہنے والے کہتے ہیں کہ خود ایلیٹ نے بھی بنیادی اعتراض کی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"It's a remarkable exposition of bogus Scholarship"

"اصل میں تو یہ جعلی علمیت کا مظاہرہ ہے۔"
اس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔

(ویسٹ لینڈ کی ۷۵ویں سالگرہ کے سلسلے میں لکھا گیا ہے)

حواشی

(۱) یہ غلطی مغربی یورپ کے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی کی۔ ایک بڑی تعداد ان ادیبوں کی سوویت انقلاب کے سحر میں اس طرح مبتلا ہوگئی کہ تیس پینتیس برس تک استالینی آمریت، تطہیر، اور فکری پابندیوں پر یقین کرنے کا جی ہی نہ چاہا۔ (ملاحظہ فرمائیے۔ مائیکل ہالرائڈ کی تازہ ترین تصنیف۔ برنارڈ شا کی سوانح عمری جلد ۳)

(۲) اصل میں یہ لائن شیکسپیئر کی ہے (Tempest) مگر ایلیٹ نے اس سیاق و سباق میں استعمال کی ہے کہ اس کی اپنی تصنیف لگتی ہے۔

(۳) بڑے لوگوں کی بڑی باتیں "صاحب" نے ایلیٹ کے بارے میں لکھا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ اگر ہم یہی بات اقبال کے بارے میں کہیں جس نے ایلیٹ کے دور میں بلکہ اس سے پہلے ہی یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک اچھا شاعر صاحب تفکر ہونے کے ساتھ صاحب ایمان و یقین بھی ہو سکتا ہے تو دوسرے نہیں بلکہ خود اردو کے نابغہ حضرات ہماری کھال ادھیڑنے پر تیار ہو جائیں گے۔ (مصنف)

جلد۱، شمارہ ۱۰۳ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء

مدیر: نصیر احمد ناصر

قیمت موجودہ شمارہ 80 روپے

زرِ سالانہ:

پاکستان: 300 روپے

دیگر ممالک کیلئے: 1000 روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

17-D سیکٹر B-2

میرپور (آزاد کشمیر)

پوسٹ کوڈ 10250 ، پاکستان

روم نمبر ۱، فرسٹ فلور، اعوان پلازہ، شادمان مارکیٹ، لاہور

مدیر : نصیر احمد ناصر